دنیا کے وہ بیس ممالک جن کے پاس تیل کے ذخائر کا ۹۵٪ حصہ ہے ان میں بارہ مسلم ممالک شامل ہیں جن کے پاس مجموعی طور پر تیل کا ۶۸٪ ذخیرہ موجود ہے۔ کچھ یہی حال قدرتی گیس کا ہے جس کے نصف سے زائد ذخائر مسلم علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔ امت مسلمہ جو اس وقت ۵۷ چھوٹے بڑے ملکوں کا مجموعہ ہے نہ صرف یہ کہ جغرافیائی اعتبار سے اہم علاقوں میں واقع ہے بلکہ خود مغربی تہذیب کے عین قلب میں اب مسلمانوں کی قابل ذکر آبادی وجود میں آ گئی ہے۔ اور سب سے اہم بات تو یہ کہ ہم مسلمان صرف تیل اور دوسرے فطری وسائل سے مالا مال نہیں بلکہ خدا کی آخری اور غیر محرف کتاب بھی ہمارے ہی درمیان موجود ہے۔ جزیرۃ العرب میں تیل کی یہ دولت ایک بڑی خدائی اسکیم کا حصہ ہے۔

۱۴

تہذیب کی تشکیل جدید

ہم جس تہذیب میں سانس لے رہے ہیں وہ اپنے کمال عروج کے بعد زوال کی طرف گامزن ہے۔ مغرب کی یہ تہذیب جس نے فی زمانہ پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے بنیادی طور پر انجن اور ایندھن کی رہین مِنّت ہے۔ صنعتی انقلاب کی ابتداء سے تاجرانہ سرمایہ داری کے ظہور اور انٹرنیٹ کی خیالی دنیا کے قیام سے خلائی تسخیر کے کارناموں تک دیکھا جائے تو یہ سب کچھ بنیادی طور پر تیل کے بے محابا استعمال کی ایک دلچسپ داستان ہے اور بس۔ یہ عہد جسے ہم بجا طور پر تیل کا عہد کہہ سکتے ہیں عالمِ انسانیت کے لیے ایسی اکتشافات وایجادات سے عبارت ہے جس کی کوئی مثال نہ پہلے ملتی ہے اور شاید نہ آنے والے دنوں میں مل سکے۔ سچ تو یہ ہے کہ تیل کی دریافت سے زندگی کے طور طریقوں میں بنیادی نوعیت کی تبدیلی واقع ہوگئی ہے حتیٰ کہ ہمارا رہنا سہنا، کھانا پینا بلکہ غور وفکر کے انداز تک یکسر بدل گئے ہیں۔ انسانی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے جب اس سرزمین پر چھ بلین کی آبادی موجود ہے لیکن اس کے باوجود اشیائے خورد ونوش کی بہتات ہے۔ ہم میں سے اکثر لوگ ابن بطوطہ اور مارکو پولو سے کہیں زیادہ سفر کی لذتوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ طول العمری کا اوسط ماضی کے مقابلے میں خاصا بڑھ گیا ہے۔ اینٹی بایوٹک اور درد کش دواؤں کے سہارے جسمانی آلام پر بھی بڑی حد تک قابو پایا جاسکا ہے۔ گویا انسانی تہذیب اپنے سفر میں جوں جوں آگے بڑھتی جاتی ہے ایسا محسوس ہوتا ہے تیل کی مزید مقدار ہماری بقیہ ماندہ کلفتوں کا مداوا کرسکتی ہے۔

یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے اب دوسرا رخ بھی ملاحظہ کیجئے۔ آج جب تیل کی قیمت ماضی کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ

ہوچکی ہے اوراس مسلسل بڑھتی قیمت نے عالمی سطح پرمختلف قسم کے اندیشوں کوجنم دیا ہے ایسامحسوس ہوتا ہے کہ ہم اچانک خواب سے بیدار ہوگئے ہوں۔شاید پہلی بارعوامی سطح پر یہ احساس عام ہوا ہے کہ ہم جس بےسمت ترقی کی راہ پراب تک گامزن تھے وہ بنیادی طور پرتیل کے بےمحابانہ استعمال کا ایک روشن پہلو تھا۔گذشتہ سوسال کے عرصے میں تیل پر ہمارا انحصاراس قدر بڑھتا گیا کہ اب جب تیل کی بڑھتی قیمتیں ہماری معیشت کا کس بل نکالتی محسوس ہوتی ہیں ہم پراچانک یہ انکشاف ہوا ہے کہ تیل جو ہماری تہذیب کا ایندھن ہےشاید بہت جلدختم ہونے کو ہے۔اوراگرایسا ہوگیا تو ہماری اس مبنیٰ برتیل تہذیب کا کیا ہوگا؟ کہیں ایسا تونہیں کہ ہماری تہذیب ایک ایسے راستے پرمحوخرام ہے جہاں تاریخ کا پردہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گرجاتا ہو۔ان باتوں کوقربِ قیامت کی پیش گوئیوں پرقیاس کرنا شاید مسئلہ کی سنگینی سے پہلوتہی ہو۔ضرورت اس بات کی ہے کہ مستقبل کے اس بھیانک منظر نامے کا کھلی آنکھوں اورٹھنڈے دل ودماغ سے تجزیہ کیا جائے۔

مسئلہ کی تفہیم کے لیے چندمثالیں شاید چشم کشا ہوں۔پلاسٹک کی خوبصورت بوتلوں میں پانی کی ایک بوتل جو ہماری میز پر پہنچتی ہےاس پرکم ازکم دوبوتل تیل کا صرفہ آتا ہے۔یہ اس طرح کہ پانی نکالنے کے لیے زیرزمین کھدائی، پانی کی تطہیراس کی پیکنگ اور بالآخر دور دراز مقامات تک ان بوتلوں کوصارفین کے ہاتھوں میں پہنچانے تک خاصا تیل جل چکا ہوتا ہے۔پھر یہ کہ پلاسٹک کی جن بوتلوں میں یہ پانی فروخت ہوتا ہے وہ بھی تو تیل ہی کی تطہیر کے دوران ان سے کشید کئے گئے مادوں سے تیار کی جاتی ہیں۔ترقی یافتہ ملکوں بالخصوص امریکہ میں،تیل کے بےمحابا استعمال کی کہانی مجرمانہ بلکہ بہیمانہ حدتک افسوس ناک ہے۔تنہا امریکہ عالمی پیداوار کا ایک چوتھائی تیل خرچ کرڈالتا ہے۔سال ۲۰۰۲ء کے اعدادوشمار کے مطابق امریکہ میں ایک کیلوری اجناس خوردونوش کی پیداوار پرتقریباً دس کیلوری تیل اوراس کے متعلقات کا صرفہ آتا ہے۔ ڈیل پی فر(Dale Allen Pfeiffer)نے اس تناسب پرتبصرہ کرتے ہوئے صحیح لکھا ہے کہ سچ پوچھئے تو لوگ غذا نہیں کھاتے بلکہ بالواسطہ طور پرتیل اوراس کے متعلقات کھارہے ہیں۔(دیکھئے fromthewildeness.com) اجناس کی پیداوار اور اشیائے خوردونوش کی ترسیل وتنظیم میں،حتی کہ کھاداوراس کے متعلقات سے لے کرکھیتی باڑی کے سامان مثلاً ٹریکٹر،آب پاشی اورغلہ اکٹھا کرنے سے لے کر اسے دوسری جگہ منتقل کرنے تک تیل کے بنیادی رول کونظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔فی زمانہ اشیائے خوردونوش کا طویل مسافت طے کرنا اوران چیزوں کا بھی بیرون ممالک سے برآمد کرنا جو مقامی طور پر دستیاب ہوں معمول کی بات سمجھی جاتی ہے۔مثال کے طورغیرمسکرحلال بیئر جو ہالینڈ اورسوئزرلینڈ میں کشید کی جاتی ہے ہزاروں میل دور شائقین کے لیے مکہ اور مدینہ کے شہروں میں دستیاب ہوتی ہے۔عقل کہتی ہے کہ کھانے پینے کی چیزوں کوطویل مسافت سے برآمد کرنے کے بجائے مقامی طور پراس کی پیداوار کہیں زیادہ مناسب ہےلیکن جدیدطرزِفکر ہمیں یہ بتاتا ہے کہ زندگی جینے کا یہ طریقہ دراصل گلوبلائیزیشن کی برکتوں کا ظہور ہے۔

کسی بھی قابل ذکر شئے کو لیں اس کے پیچھے آپ تیل کے عمل دخل کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ موٹر کار ہو یا کمپیوٹر، مائکرو چپ ہو یا فلک بوس عمارتیں یہ سب کچھ تیل ہی کی رہین منت ہیں۔ ایک مائکرو چپ کی ہی مثال لیجئے جو بظاہر انگلی بھر ایک چھوٹا سا پلاسٹک کا ٹکڑا نظر آتا ہے لیکن صرف اس چھوٹے سے پلاسٹک کے ٹکڑے کو بنانے پر تیل کی بڑی مقدار صرف ہوتی ہے۔ امریکی کیمیکل سوسائٹی کے مجلّہ *Environmental Science and Technology* (Dec 2002) کے مطابق 32MB DRAM کے بننے میں کوئی ساڑھے تین پونڈ تیل خرچ ہوتا ہے اس پر 70 پونڈ پانی کا خرچہ مستزاد ہے۔ جوئیل گاریو کی زبانی اس داستانِ حماقت کی تفصیل آپ بھی سنئے:

> مائکرو چپ علیحدہ علیحدہ نہیں بنائے جاتے بلکہ انہیں بیک وقت سلکن ویفر کے اوپر طبع کیا جاتا ہے جس کا قطر چار انچ سے زیادہ نہیں ہوتا۔ سلکن ویفر پر یکے بعد دیگرے مختلف سطحیں اس طرح چھاپی جاتی ہیں کہ بظاہر تو وہ ایک چھوٹا سا چپ نظر آتا ہے لیکن مختلف غیر مرئی طباعت کی وجہ سے اس میں خاصی قوت مدافعت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس عمل میں توانائی کی ایک بڑی مقدار صرف ہوتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہر غیر مرئی سطح کے طبع کرنے پر اس چھوٹے سے چپ کو بار بار اس طرح پکایا جاتا ہے کہ اس کا درجۂ حرارت ٹکنالوجی کی بلند سطح تک جا پہنچتا ہے۔
>
> (*The Nine Nations of North America*, p271, 1981)

تیل کے متعلقات مثلاً پلاسٹک، مصنوعی ربر، مصنوعی روئی، ہائٹروجن کھاد اور صابن وغیرہ نے ہمارے اردگرد کی دنیا کو نئی شکل دینے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ تعمیراتی سامان ہو یا مصالحہ، پلاسٹک کے پائپ ہوں یا الکٹرانک سامان، فرنیچر ہو یا تصویر کشی میں استعمال ہونے والی فلمیں یا اندرونِ خانہ استعمال میں آنے والے آرائشی ساز وسامان یہ سب دراصل تیل کے تلچھٹ سے بنائے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ قالینیں، پردے، بستروں کے گدے، فائبر کے گلاس، پیراکی کے لباس، پانی کے اندر استعمال ہونے والے کپڑے، شب خوابی کے رومانی ملبوسات گویا آپ جس چیز کا بھی نام لیں پتہ چلے گا کہ وہ پالسٹر یا سینتھٹک فائبر کی ہی کوئی بدلی ہوئی شکل ہے۔ موٹر گاڑیوں کی چہل پہل جس پر ہماری تہذیب کا دار و مدار ہے صرف تیل کے صرفے پر نہیں چلتی بلکہ تیل ہی سے تعمیر بھی کی جاتی ہے کہ مصنوعی ربر کے بغیر گاڑیوں کے سبک رفتار پہیے وجود میں نہیں آسکتے۔ اکرائلک کے مصنوعی دھاگوں نے آج بڑے پیمانے پر اونی اور سوتی کپڑوں کی جگہ لے لی ہے کہ اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو زمین کی فطری پیداوار چھ بلین انسانوں کا جسم ڈھکنے کے لیے قطعی ناکافی ہوتی۔ کچھ یہی حال اجناس کی پیداوار کا بھی ہے کہ اگر تیل کی تلچھٹ سے پیدا ہونے والی کھادوں کا استعمال ترک کر دیا جائے تو ہماری زمین کے لیے چھ بلین انسانوں کے لیے غلہ پیدا کرنا مشکل ہو جائے۔ تیل نہ صرف یہ کہ ہماری مشینی زندگی کی جان ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ نئی تہذیب بنیادی طور پر تیل اور اس کی تلچھٹ کی ہی رہین منت ہے۔

اب آیئے ذرا زمینی دنیا سے دور اس عالم خیال کا بھی کچھ بیان ہو جائے جسے ہم انٹرنیٹ کہتے ہیں اور جسے بجا طور پر اس دنیا

کا توسیعہ سمجھنا چاہیے۔ انٹرنیٹ انسانی تاریخ کی سب سے بڑی مشین ہے جس میں لاتعداد کمپیوٹر اور اس کے متعلقات دنیا بھر میں پھیلے ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے باہم مربوط ہیں۔ ہر لمحہ دنیا میں کروڑ ہا کمپیوٹر انٹرنیٹ کے سرور اور ان سے متعلق مختلف نوعیت کی چھوٹی بڑی مشینیں مسلسل بجلی کے صرفے میں مصروف ہیں۔ اس خوف کے باوجود کہ انٹرنیٹ کی غیر معمولی توسیع اور صارفین کا مسلسل بڑھتا دباؤ اس نظام کو کسی وقت بھی لے ڈوبے گا، حقیقت یہ ہے کہ ہر شخص اب انٹرنیٹ پر اپنی موجودگی کے لیے تگ ودو کرتا دکھائی دیتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر آپ انٹرنیٹ پر موجود ہیں تو اس دنیا میں آپ کا وجود ہے ورنہ نہیں۔ مالیاتی ادارے، اکتشافی علوم کی تجربہ گاہیں، طب وصحت کا جدید نظام، سیر وتفریح کے ادارے اور دانش گاہیں گویا ہر کوئی اب بڑی حد تک انٹرنیٹ ہر انحصار کرتا ہے۔ عام طور پر اس طرف ہمارا ذہن بھی نہیں جاتا کہ انٹرنیٹ مجموعی توانائی کا ایک قابل ذکر حصہ ہڑپ کر جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امریکہ میں بجلی کی ۹ء۴ فیصد پیداوار اور دنیا بھر میں مجموعی طور ۳ء۵ فیصد انٹرنیٹ کے نظام کو متحرک رکھنے میں صرف ہو جاتی ہے۔ (دیکھئے Uclu.com) موجودہ دنیا کی پر آسائش طرز زندگی کو دیکھتے ہوئے ایک امریکی مصنف جے، ایچ کونسٹلر نے اپنی کتاب The Long Emergency میں یہ اندازہ لگایا ہے کہ تیل کی پیدا کردہ سہولتوں نے ایک شخص کے لیے اتنی ہی سہولتیں پیدا کر دی ہیں جو زمانۂ قدیم میں تین سو غلاموں کی فراہمی سے پیدا ہوتی تھی۔ اب جب دنیا میں تیل ختم ہونے کے آثار پیدا ہو چلے ہیں تیل کی تہذیب کا پیدا کردہ یہ نیا عہد غلامی بھی اب رخصت ہوا چاہتا ہے۔

دیکھا جائے تو تیل کا غیاب ہماری تہذیب کے غیاب سے عبارت ہوگا۔ ابھی بہت دن نہیں ہوئے جب ہم نے تیل کی دریافت کی اور اسے اپنی آسائش کے لیے مسخر کیا۔ دیکھتے دیکھتے تیل نے ہماری زندگی کا انداز کچھ اس طرح بدل دیا کہ دنیا ہمارے لیے یکسر مختلف ہوگئی۔ یہ سب کچھ اچانک ہوا۔ بالکل اسی طرح جب تیل کے کنویں اچانک خشک ہو جائیں گے، مابعد تیل کی تہذیب میں ہمارا داخلہ ایک ایسے بحران کو جنم دے گا جس کا واقعی اندازہ لگانا ابھی مشکل ہے۔ ذرا غور کیجئے آج اگر تیل کی رسد اچانک رک جائے تو ہمارا کیا حال ہو۔ جدید دنیا آناً فاناً زمین بوس ہو جائے، اشیائے خورد ونوش کی سپلائی سے لے کر پانی کی فراہمی، بیت الخلاء کا استعمال، گویا نئی تہذیب کے تمام جلوے چشم زدن میں ہوا ہو جائیں۔ افسوس کہ مستقبل کا یہ منظر نامہ جو بظاہر سائنس فکشن محسوس ہوتا ہے اب ہمارے دروں پر دستک دے رہا ہے۔

بدقسمتی سے اب ہم ایک ایسے عہد میں داخل ہو رہے ہیں جب تیل کے کنوؤں کے خشک ہونے کے آثار پیدا ہو چلے ہیں۔ جب سے ہم نے تیل دریافت کیا اور اس کے اندھا دھند استعمال سے ایک نئی تہذیب کی داغ وبیل ڈالی تب سے اب تک کوئی ستّر اسی سال کے عرصے میں ہم نے دریافت شدہ ذخائر کا کوئی پچاس فی صد تیل استعمال کر ڈالا ہے۔ فی زمانہ معاشی اور صنعتی منظرنامے پر ہندوستان اور چین کے ظہور سے اس سوال کی دھار خاصی تیز ہوگئی ہے کہ تیل کا بقیہ ماندہ پچاس فیصد ذخیرہ کیسے خرچ

کرنے کا موقع ملے گا۔ امریکہ اور یورپ میں معاشی ترقی کے تجربوں نے اس کلیہ کی صداقت واضح کر دی ہے کہ جو ملک جتنا زیادہ تیل صرف کرے گا وہاں اتنی ہی زیادہ صنعت وجود میں آئے گی، پیداوار میں اضافہ ہوگا اور اتنی ہی زیادہ خوشحالی اس ملک کے حصے میں آئے گی۔ اگر تین سو ملین آبادی پر مشتمل امریکی معاشرہ پچیس فی صد عالمی پیداوار صرف کرنے کے نتیجے میں ایک معاشی قوت بن کر ابھر سکتا ہے تو ذرا غور کیجیے کہ ہندوستان اور چین جو امریکہ کی تین گنا اور چار گنا آبادی پر مشتمل ہیں اگر اسی درجے کی خوشحالی کے لیے اس طرح تیل صرف کرنے کی دوڑ میں لگ گئے تو مستقبل میں تیل کی اس تہذیب کا کیا ہوگا۔ حالات اس بات کی طرف مسلسل اشارے کر رہے ہیں کہ آنے والے دنوں میں مختلف اقوام وملل کے مابین تیل کے حصول کے لیے رقابت اور رسہ کشی تیز ہوتی جائے گی۔ جنوب مشرقی ایشیاء میں جس طرح تیز رفتاری سے صنعتی معاشرے وجود میں آ رہے ہیں آنے والے دنوں میں اتنے بڑے پیمانے پر انہیں تیل کی بآسانی فراہمی ممکن نہ ہو سکے گی۔ ترقی یافتہ ممالک نے گذشتہ ستر سالوں میں جتنا تیل صرف کیا ہے اتنا تیل، یعنی پچاس فی صد بقیہ ماندہ ذخیرہ، ترقی پذیر ممالک کے ہاتھوں پچیس تیس سالوں میں خرچ ہو جائے گا۔ پھر آنے والے دنوں میں تیل کے بغیر تہذیب کی شکل وصورت کیا ہوگی۔ یہ وہ منظرنامہ ہے جس کے حقیقی ادراک کی نہ تو کسی میں ہمت ہے اور نہ ہی اس کے لیے کسی گوشے سے کوئی مؤثر آواز سنائی دیتی ہے۔

تیل کے موجودہ ذخائر جس کا نصف ہم نے محض ستر سالوں میں جلا ڈالا ہے ان کے بنانے میں سورج کی شعاعوں کو کوئی پانچ سو ملین سالوں تک محنت کرنا پڑی ہے۔ انسانی تاریخ کی اس عظیم نعمت کو ہم نے اپنی غیر منصوبہ بند جاہلانہ روش کے ذریعے انتہائی مختصر مدت میں صرف کر ڈالا۔ حقیقی معنوں میں تیل کا عہد ۱۹۳۰ء سے شروع ہوا جب بڑے پیمانے پر تیل کے عمل دخل نے ہماری تہذیب کا قالب بدلنا شروع کیا اور اگر تیل کے صرفے کی یہی رفتار جاری رہی تو ۲۰۳۰ء تک بقیہ ماندہ ذخیرہ ختم ہو جائے گا۔ مغربی ماہرین جب پیک آئل (peak-oil) کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو اس سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے ہم تیل کی نصف دریافت شدہ مقدار صرف کر چکے ہیں یا اب اس نشان کو بہت جلد پہنچنے والے ہیں۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی میں امریکہ کے حوالے سے ایم، کے، ہبرٹ نے یہ پیش گوئی کی تھی کہ امریکہ میں تیل کی پیداوار ستر کی دہائی میں اپنے عروج کو جا پہنچے گی جس کے بعد امریکی تیل کی پیداوار میں زوال آ جائے گا۔ ہبرٹ کی یہ پیش گوئی دریافت شدہ ذخائر کے تجزیے پر مشتمل تھی جو بڑی حد تک صحیح ثابت ہوئی۔ البتہ اگر ذرائع ابلاغ نے اسے اس وقت خطرے کی گھنٹی کے طور پر پیش نہیں کیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس اثناء دنیا کے مختلف علاقوں میں تیل کے نئے ذخیرے مسلسل دریافت ہو رہے تھے۔ البتہ آج صورتحال یکسر بدل چکی ہے۔ نہ صرف یہ کہ ہم بہت جلد اس نشان کو عبور کرنے والے ہیں جسے پیک آئل کہا جاتا ہے، بلکہ گذشتہ برسوں میں نئے ذخائر کی دریافت بھی تقریباً معدوم ہوتی گئی ہے۔ کونسٹلر کے مطابق سال ۲۰۰۰ء میں سولہ نئے ذخائر دریافت ہوئے ۲۰۰۱ء میں آٹھ جب کہ ۲۰۰۳ء میں کسی

نئے ذخیرے کی دریافت سے ہم عاجز رہے۔ پیک آئل کے سلسلے میں ماہرین میں قدرے اختلاف ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ ۲۰۰۶ء میں ہم تیل کا پچاس فی صد ذخیرہ ختم کر چکے، کوئی کہتا ہے کہ ابھی اس نشانے تک پہنچنے میں دو چار سال کی مہلت اور باقی ہے۔ البتہ اس بارے میں ایک بڑے حلقے کا اتفاق ہے کہ دریافت شدہ ذخیروں میں جوں جوں کمی کا احساس بڑھتا جائے گا تیل کی قیمتوں میں حیرت انگیز اضافہ ہوگا۔ رسد اور طلب کے مابین توازن کا برقرار رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ پھر دنیا کا مستقبل اس سوال کے گرد گردش کرے گا کہ بقیہ ماندہ پچاس فی صد تیل کے ذخیرے کو کس کمال تدبیر کے ساتھ خرچ کیا جائے۔ اس سوال کے جواب پر عالم انسانیت کے مستقبل کا انحصار ہوگا۔ تیل کے لیے باہم مسابقت جوں جوں بڑھے گی اندیشہ ہے کہ مختلف ممالک تیل میں اپنا حصہ وصول کرنے کے لیے خود کو ایک لامتناہی کشمکش بلکہ جنگوں میں گھرا پائیں گے۔ ۲۰۰۶ء میں جب امریکی صدر جارج بش نے امریکی قوم کے نام اپنے خطاب میں اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ امریکہ کو تیل کی لت پڑ چکی ہے تو دراصل وہ غیر شعوری طور پر اس خطرناک مستقبل کی طرف اشارہ کر رہے تھے جو قوت کے نشے سے سرشار قوم مجبور و بے بس قوموں کے ساتھ کیا کرتی ہے۔ جب امریکہ کو تیل کی لت پڑ چکی ہو، جس کا اعتراف ببانگ دہل اس کے صدر کی زبانی ہوتا ہو، تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ تیل کی پیاس بجھانے کے لیے مشرقِ وسطیٰ میں کیا کچھ نہ کر گزرے گا۔ بش اور چینی دونوں کا تعلق تیل کی صنعت سے ہے۔ انہیں خوب معلوم ہے کہ جدید زندگی میں تیل کی کیا اہمیت ہے۔ اس وسیع تناظر میں اگر امریکی اقدام پر نظر ڈالیے تو عراق اور افغانستان میں امریکی جنگی عزائم کے پیچھے مختلف پراسرار حقیقتوں کا سراغ بآسانی لگ سکتا ہے۔ تیل کی بنیادی اہمیت اور اس کے ختم ہوتے ذخائر نے اب اس سوال کو جنم دیا ہے کہ آنے والے دنوں میں زندہ رہنے کا حق کسے ہے۔ عراق میں چار ہزار امریکی فوجیوں کی ہلاکت اور انتیس ہزار فوجیوں کے معذور ہونے کے بعد بھی اگر امریکی عراق سے واپسی میں دیر لگا رہے ہیں تو اس کی وجہ یہی ہے کہ اب خون کے بدلے تیل کی تجارت کا آغاز ہو چکا ہے۔

سال ۲۰۰۵ء میں مجھے اٹلی کے سیاحتی شہر وینس میں سائنس کے مستقبل پر پہلی بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کا موقع ملا جہاں مسلسل کئی گھنٹوں تک مستقبل کے ایندھن کے بارے میں دنیا کے بہترین دماغ بحث و مباحثہ میں مصروف تھے۔ ہائڈروجن کو تیل کے متبادل کے طور پر دیکھنا کوئی نیا خیال نہیں ہے البتہ اس کو سستا اور قابل عمل بنانا ہنوز ایک شاعرانہ خیال معلوم ہوتا ہے۔ رہی شمسی توانائی سے ایندھن کے حصول کی بات تو واقعہ یہ ہے کہ اس عمل میں جتنی توانائی صرف ہوتی ہے، شمسی پینل کی تعمیر اور اس کی ترتیب و تہذیب میں جتنا ایندھن استعمال ہو جاتا ہے، شمسی شعاعوں کے ذریعے اتنی انرجی کا حصول بھی ممکن نہیں ہوتا۔ رہا کوئلہ یا قدرتی گیس تو اس کے بھی ذخائر محدود ہیں اور یہ زیادہ سے زیادہ ایک ایسی تہذیب کو سہار سکتے ہیں جسے انیسویں صدی کی تہذیب کہا جا سکتا ہے۔ یہی حال نیوکلیائی توانائی کا ہے۔ اگر پوری دنیا نیوکلیائی توانائی کو اپنا ہدف بنا لے تو

یورینیم بھی بہت دنوں تک ہمارا ساتھ نہ دے پائے گا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ تیل نے جس طرح ہماری زندگی کے مظاہر بدل ڈالے ہیں ان مظاہر کو سہارنے کی قوت کسی دوسرے متبادل ایندھن میں نہیں ہے۔ ہواؤں کے فطری بہاؤ اور موجوں کی روانی سے بھی ایندھن اخذ کیا جاسکتا ہے لیکن اگر ہم ایسا کرنے پر مجبور ہوئے تو وہ ایک دوسری دنیا کا منظرنامہ ہوگا۔

تیل کی تہذیب کا یہ تاریک پہلو اگر اب تک ہماری نگاہوں سے اوجھل رہا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے ہمارے ذرائع ابلاغ سائنسی انکشافات کا صرف خوشنما پہلو پیش کرتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں BBC4 میں مستقبل کے حوالے سے جو منظرنامہ دکھایا گیا ہے اس میں مستقبل بظاہر بڑا دلچسپ نظر آتا ہے۔ ایک ایسی دنیا جہاں انسانی اعضائے رئیسہ تجربہ گاہوں میں بنائے جارہے ہوں، جہاں ابعادِ ثلاثہ کے ٹیلی ویژن ہمارے حظ کا سامان فراہم کرتے ہوں، انسان نما روبوٹ ہماری خدمت پر مامور ہوں اور سب سے حیرت انگیز یہ کہ ٹیلی فون کی آوازوں اور ڈیجیٹل پیغامات کی طرح مادی اشیاء کی ترسیل بھی ممکن ہوگئی ہو۔ میشیو کاکو جو ایک معروف سائنسی مفکر ہیں ان کا خیال ہے کہ آنے والے دنوں میں انسان بے جان اشیاء سے جاندار پیدا کرنے پر قادر ہوسکے گا اور تقریباً اسے وہی قوت حاصل ہوجائے گی جو اب تک صرف خدا کے لیے مخصوص سمجھی جاتی ہے۔ اس قسم کے بیانات سننے کے بعد معاً یہ خیال آتا ہے کہ کیا عہد جدید کے سائنسی مفکرین تہذیب کے دوسرے رخ سے بھی آگہی رکھتے ہیں۔ جو لوگ مستقبل کے سلسلے میں ان حسین خوابوں کی تعمیر میں مصروف ہیں کیا انہیں اس بات کا قطعی اندازہ نہیں کہ جب آنے والے دنوں میں تیل ہی نہ ہوگا تو مستقبل کی اس مشینی زندگی کا جاری رکھنا کیسے ممکن ہوسکے گا۔ رہی یہ بات کہ جو لوگ بڑی آسانی سے یہ کہہ دیتے ہیں کہ اگر تیل ختم ہوا تو انسان کچھ اور دریافت کرلے گا وہ شاید اس حقیقت سے آگاہ نہیں کہ کچھ اور کی دریافت میں نصف صدی بیت گئی حتی کہ ہم تیل کے لیے مسابقت اور جنگوں کے مرحلے میں داخل ہوچکے ہیں۔ بعض سائنسی مفکرین جن میں کاکو بھی شامل ہیں مسئلہ کی سنگینی کو نظر انداز کرتے ہوئے تصوراتی متبادل سے کام چلاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر زمین پر موجود انرجی کے تمام ذخائر ختم ہوگئے تو ہم دوسرے سیاروں پر اپنی کمندیں ڈالیں گے۔ کاکو کا خیال ہے کہ ہماری کہکشاں میں بہت سے ایسے سیارے بھی پائے جاتے ہیں جن پر زندگی کی کوئی رمق نہیں پائی جاتی۔ جنہیں ہم مردہ سیارے سمجھتے ہیں وہ دراصل انرجی کے ذخائر ہیں۔ اس خیال کے حامیوں کا کہنا ہے کہ زمین کا ہر طرح عرق کشید کرلینے کے بعد ہم دوسرے سیاروں کا رخ کریں گے۔ زمین پر انسانی تہذیب کی تباہی کے پیش نظر بعض لوگوں نے یہ منصوبہ بھی بنا رکھا ہے کہ چاند پر سفینۂ نوح کے بمثل ایک ایسی لائبریری تعمیر کردی جائے جس میں انسانی تہذیب کو محفوظ کیا جاسکے تاکہ مستقبل میں زمین کی تباہی کے نتیجے میں انسانی تہذیب کا اگر یکسر خاتمہ ہوجائے تو مستقبل کے انسانوں کے لیے تہذیب کے کچھ باقیات محفوظ رہ سکیں۔

جب سے کارل ساگن نے سائنس کو عوامی گفتگو کا موضوع بنایا ہے اور جب سے خلائی سائنس ٹیلی ویژن کے ذریعے

ہمارے ڈرائنگ روم کا حصہ بنی ہے سائنس کے مستقبل کے سلسلے میں سائنس فکشن کے انداز میں گفتگو کرنے کا رواج خاصا عام ہو گیا ہے۔ شاید اس کا سبب یہ ہے کہ عام انسانوں کے لیے اعداد و شمار کا سمجھنا آسان نہیں ہوتا اور ذرائع ابلاغ مسئلہ کے صرف اس پہلو پر گفتگو کرنا مناسب جانتے ہیں جو عوامی ذہن کو اپنی طرف متوجہ کر سکے۔ بی بی سی ۴ کا مقبول عام پروگرام جس کا ابھی ہم نے حوالہ دیا اس قبل کی بہترین مثال ہے جس میں پندرہ بیس سالوں کے اندر نئی نیوکلیائی ٹیکنالوجی (fusion) سے بجلی کے حصول کا خواب دکھایا گیا ہے۔ مستقبل کی اس دنیا میں انتہائی ترقی یافتہ انسان نما روبوٹ میدانِ جنگ میں نبرد آزما دکھائے گئے ہیں اور اس بات کی بشارت دی گئی ہے کہ جلد ہی کینسر، امراضِ قلب اور دیگر مرض الموت پر نہ صرف یہ کہ قابو پایا جا سکے گا بلکہ انسان اپنے جسم کو مکمل طور پر کنٹرول کرنے کی پوزیشن میں ہوگا اور درازئ عمر پر یکسر روک لگ جائے گی۔ ایک ایسی دنیا کا خواب جہاں انسان مستقبل کو اپنی مٹھی میں کر سکے دراصل ساگن جیسے سائنس دانوں کے رومانی خیالات کا پروردہ ہے۔ ساگن عالم موجودات کے سلسلے میں سائنسی سے کہیں زیادہ رومانوی نظریہ رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کروڑ ہا کروڑ کہکشاں میں نہ صرف یہ کہ زندگی اپنی پوری سج دھج کے ساتھ قائم ہے بلکہ ایک سیارہ کے لوگ دوسرے سیاروں سے رابطے کے لیے ایک دوسرے کو مسلسل برقی ومقناطیسی سگنل بھیج رہے ہیں۔ البتہ صدیوں پہلے بھیجے گئے یہ اشارے اگر اب تک ہماری یافت سے باہر ہیں تو اس کی وجہ سیاروں کے مابین طویل مسافت ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ساگن جیسے عظیم سائنسدانوں کی تحریروں اور تقریروں سے سائنس کے عوامی قالب کی تشکیل میں بڑی مدد ملی البتہ ان کے رومانوی تصورات نے ان حقائق پر پردہ ڈال دیا جو عملی دنیا میں سائنس کو مستقبل کے حوالے سے درپیش ہیں۔ کہکشاں پر کمندیں ڈالنا ایک امید افزاء خیال تو ضرور ہے۔ البتہ اس حقیقت کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے کہ اب تک جس انداز سے ناسا نے خلائی مشن کو انجام دیا ہے جس طرح اس پر بے دریغ دولت اور تیل کی گرانقدر مقدار صرف ہوتی رہی ہے اس طرز تحقیق و جستجو کی بہت زیادہ گنجائش اب مشکل دکھائی دیتی ہے۔ بظاہر یہ خیال خوش کن ضرور ہے کہ انسان ایندھن کی تلاش میں دوسرے سیاروں کا رخ کرے لیکن اس تلخ حقیقت کو کیا جائے کہ آنے والے دنوں میں جب تیل کے ایک ایک قطرے کے لیے قومیں باہم برسرِ پیکار ہوں گی تب اس تفریحی خلانوردی کے لیے تیل کہاں سے آئے گا۔ بعض لوگ نباتاتی ایندھن کو مسئلہ کا حل بتاتے ہیں۔ یقیناً نظری طور پر نباتاتی ایندھن متبادل کے طور پر سامنے آ سکتا ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ اگر تیل کے کنویں خشک ہو گئے تو پٹرول سے بننے والی کھاد بھی عنقا ہو جائے گی پھر زمینوں میں وہ زرخیزی نہ رہے گی جس کا فی الوقت ہم مشاہدہ کر رہے ہیں۔ ہمارے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگا کہ ہم ایندھن کی کھیتی کریں یا اشیائے خورد و نوش کی۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ تیل کے غیاب اور اس کی کھاد کے عنقا ہو جانے سے اجناس کی پیداوار میں اچانک اتنی کمی واقع ہو جائے گی کہ دنیا کی دو تہائی آبادی فتنہ و فساد اور فاقوں کے عتاب تلے دم توڑ دے گی۔

مستقبل کا غیاب

اگر تیل کی اس تہذیب کو اسی طرح انگیز کیا جاتا رہا تو ایک خوفناک تباہی ہمارا مقدر ہوگی۔ گذشتہ نصف صدی میں اس سلسلے میں ہم سے خاصی غفلت ہو چکی ہے نتیجہ یہ ہے کہ ہم ایک ایسی دنیا میں سانس لینے پر مجبور ہیں جہاں زندگی کے سلسلے میں مایوسی عام ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم ایک ایسی دنیا میں جی رہے ہوں جو اپنے اختتام کو بہت پہلے پہنچ چکی ہو۔ ہماری زندگیوں میں لطف وانبساط اور جلوہ سامانیوں کا فقدان ہے۔ ایسا لگتا ہے گویا ہم تہذیب کے اختتام کے بعد، اس کے تلچھٹ (residue) کے طور پر جینے پر مجبور ہوں۔ مغرب میں اس احساس کو مابعد جدیدیت کا نام دیا گیا ہے۔ یہ ایک ایسی دنیا کا منظر نامہ ہے جہاں زندگی جینے کی امنگ ختم ہو چکی ہو اور صاف محسوس ہوتا ہو کہ اب کسی بلند اور ارفع تصور کا حصول انسانوں کے بس سے باہر ہے۔ بظاہر یہ ایک لغو خیال معلوم ہوتا ہے کہ عہد جدید کے لوگ مابعد جدید عہد میں جیتے ہوں، لیکن جو لوگ اس تہذیب کے نبض شناس ہیں انہیں اس حقیقت کا کسی قدر ادراک ہے کہ جب احساسِ زیاں شدید تر ہو جائے اور آگے کا راستہ بند دکھائی دیتا ہو تو انسانوں کے لیے ہلا دینے والی قنوطیت ان کا مقدر بن جاتی ہے۔ رہے وہ لوگ جو مابعد تاریخ کے بجائے عین تاریخی لمحات میں جینا چاہتے ہوں جو ایک ایسی دنیا کے متلاشی ہوں جہاں ہر لحہ وقوعات کا ظہور پایا جاتا ہو، جہاں زندگی جینا سراسر لطف سے عبارت ہو، فطرت استعمال کر کے پھینک نہ دی گئی ہو اور زندگی سریع لمحاتی حظ کا نام نہ ہو، تو ان کے لیے لازم ہوگا کہ وہ مروجہ تصورِ حیات اور فکری چوکھٹے سے یکسر باہر آکر غور وفکر کی ہمت پیدا کریں۔ گذشتہ تین سو سالوں میں ہم نے غور وفکر کے جو چوکھٹے تشکیل دیئے ہیں اور فلسفیانہ مباحث کی جو ریت قائم کی ہے وہ بنیادی طور پر کسی نہ کسی گروہ یا قوم کے مفادات کے پیش نظر وضع کی گئی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ گذشتہ تین سو سالوں کی فکری روایت کا ہر اعتبار سے قلع قمع کیا جائے تب ہی ہم غور وفکر کے نئے سانچوں کی مؤثر تشکیل کر سکیں گے۔

آیئے ذرا اس نکتے کی مزید وضاحت کی جائے۔ مغرب میں حریتِ فکر ونظر کی تحریک جس حادثے کا شکار ہوئی جسے عرف عام میں Enlightenment کے زوال سے تعبیر کیا جاتا ہے خاصی بحث وتمحیص کا موضوع رہا ہے۔ البتہ مابعد جدیدیت کے حوالے سے لکھے جانے والے بیشتر تحلیل وتجزیے اگر صورتِ حال کے واقعی ادراک سے عاجز رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے تجزیہ نگاروں نے ان بنیادی تصورات کے محاکے کی کوشش کم ہی کی ہے جو ذہنی آزادی کی بے سمتی کے دوران پروان چڑھے اور جنہیں رفتہ رفتہ استناد حاصل ہو گیا۔ مثال کے طور پر تہذیب کے بنیادی تصور کو لیجئے۔ مغرب میں مہذب ہونا فی نفسہٖ کوئی جوہر نہیں بلکہ اقوام دیگر کے عادات واطوار کو اپنے خود ساختہ پیمانوں سے ناپنے کا نام ہے۔ تہذیب یا civilization کی

اصطلاح سب سے پہلے ۱۷۵۶ء میں وکٹر ریکوٹی میرابو(Victor Riqueti Mirabeau) نے استعمال کی جس نے اس لفظ کو اہل فرانس کی خودستائی سلسلے میں باندازِ ناقدانہ استعمال کیا۔ رفتہ رفتہ اس اصطلاح نے یورپ کی توسیعاتی مہم میں ایک استعماری نظریے کی حیثیت اختیار کرلی۔ انیسویں صدی میں جب یورپی اقوام دنیا کو تہذیب سے روشناس کرانے کے لیے مختلف سمتوں میں حملہ آور ہوئیں تو یورپ کی تہذیب محکوم اقوام کے لیے خیروشر کا معیار بن گئی۔ حتیٰ کہ یورپی مورخین نے اسی احساس برتری کے تحت تاریخ کی ضخیم مجلدات مرتب کرڈالیں۔ ٹوائین بی جیسا مورخ جو اپنے معروضی تاریخی مطالعے کے لیے معروف ہے وہ بھی اس تہذیبی پروپگنڈے کی زد سے نہ بچ سکا۔ ٹوائین بی نے مغربی تہذیب کو عظیم سلطنت روما کے تسلسل کے طور پر دیکھا اور اس خیال کی وکالت کی کہ جہاں دوسری تہذیبیں معمولی عروج کے بعد انتشار کا شکار ہوگئیں یا تھک کر بیٹھ گئیں وہیں مغربی تہذیب نہ صرف یہ کہ غیر معمولی بلندیاں طے کرنے میں کامیاب ہوئی بلکہ اب بھی اس میں مزید آگے بڑھنے کی صلاحیت باقی ہے۔ گو کہ سولہویں اور سترھویں صدی میں قوم پرستی اور مغربی جنگوں نے اس پر وقتی طور پر منفی اثرات ڈالے تھے۔ یہ سوال کہ اگر دوسری تہذیبوں کے مقابلے میں مغربی تہذیب کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی اور اس کے اندر اب بھی ایک عالمی حکومت کے قیام کا دم خم باقی ہے تو کیا اسے اس بات کی اجازت ملنی چاہیے کہ وہ بزور بازو ہی سہی انسانیت کے اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے آگے آئے۔ ٹوائین بی اور اس قبیل کے مصنفین تہذیبی واہمے کے اس قدر اسیر ہیں کہ وہ ہر قیمت پر مغرب کے تہذیبی مظاہر کو برپا کرنا انسانیت کی نجات کا واحد ذریعہ سمجھتے ہیں۔ بقول ٹوائین بی: ''تہذیب اگر چرچ کے زوال کے نتیجے میں پیدا ہو تو اسے تباہی پر محمول کرنا چاہئے۔ البتہ کسی تہذیب کی تباہی سے کوئی نیا چرچ یا نئی مذہبیت کو اعتبار ملے تو اسے تباہی پر محمول نہیں سمجھنا چاہئے''۔ فی زمانہ امریکہ میں نوقدامت پرستوں کا عروج اور ان کے ہاتھوں تاریخ کی آخری جنگ کی تیاری، آرمیگاڈون برپا ہونے کی خبریں، کیا اس بات کی طرف اشارہ نہیں کررہی ہیں کہ ایک نیا چرچ نامحسوس طور پر ہمارے درمیان متشکل ہورہا ہے۔

مغرب میں جو لوگ اس خیال کے قائل ہیں کہ انھوں نے تاریخ کو اپنی منشاء کے مطابق آخری منزل تک پہنچا دیا ہے اور جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ایک فیصلہ کن تہذیبی جنگ کے آخری مرحلے میں تہذیب کے دشمنوں کو شکست سے دوچار کرنے والے ہیں وہ بھی دراصل اسی اصطلاح کے اسیر ہیں جسے عرف عام میں مغربی تہذیب کہا جاتا ہے۔ پہلی بات تو یہ سمجھ لینے کی ہے کہ مغربی تہذیب ایک لغو اور موہوم تصور ہے کہ اہل مغرب جن لوگوں کو تہذیب کا دشمن قرار دیئے بیٹھے ہیں وہ شہر کی فصیل سے باہر کہیں اور نہیں پائے جاتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خود اسی تہذیب کے اندر موجود ہیں۔ متمدن برطانیہ میں ایک مسلم وزیر کا وجود، امریکہ میں ایک ہندو گورنر کی موجودگی اور وہائٹ ہاؤس کی دوڑ میں ایک سیاہ فام کی مقبولیت اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ مغربی تہذیب جن مظاہر

سے عبارت ہے اسے اب سفید فام اقوام سے کچھ زیادہ علاقہ نہیں۔ یہ سوال بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے کہ آخر مغربی تہذیب کو محض برطانوی، فرانسیسی یا جرمن شناخت کے تناظر میں کیوں دیکھا جاتا ہے۔ کیا صرف یہ تین بڑے ملّی تشخص مغربی تہذیب کا اعلامیہ ہیں؟ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ماضی میں یہ تینوں اقوام اپنے تفوق کے لیے باہم ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہی ہیں۔ مغربی تہذیب کی واقعی نمائندگی کا حق کسے حاصل ہے؟ اس تہذیب کی بنیادی کتابیں اور فکری مآخذ کیا ھیں؟ کیا یورپ کی مسلم ریاستیں مثلاً بوسنیا ہرزیگوونیا، کوسوو اور ترکی اسی تہذیب کا حصہ ہیں یا اسلام سے ان کی وابستگی نے انہیں اس تہذیب سے خارج کر دیا ہے؟ کیا اہل یہود جنہیں اس تہذیب کی بعض امہات الکتب مثلاً Relativity: The Special and General Theory, The Interpretations of Dreams, The Selfish Gene لکھنے کا شرف حاصل ہے، وہ اسی تہذیب کا حصہ کہے جائیں گے؟ تو کیا مغربی تہذیب یہودی عیسائی کوششوں کا امتزاج ہے؟ ایسا یقین کرنا آسان نہیں کہ مغرب میں اہل یہود ہمیشہ اجنبی عنصر کے طور پر دیکھے گئے ہیں، اور ان کے خلاف مخاصمت کی طویل تاریخ پائی جاتی ہے۔ یہ خیال کہ مغربی تہذیب دراصل مابعد عیسائیت کے عہد میں پیدا ہونے والے خلاء سے عبارت ہے بھی قابل قبول نہیں ہوسکتا اس لیے کہ روسی کمیونسٹ جو اس تہذیب کے دشمن کے طور پر دیکھے جاتے رہے ہیں وہ بھی دراصل اسی تہذیب کے پروردہ ہیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ کمیونسٹوں کی کتابِ مقدس داس کیپٹل مغرب کے عین بطن میں معرض وجود میں آئی ہے۔ سچ پوچھئے تو مغربی تہذیب ایک ایسا نظری مفروضہ ہے جسے سرمایہ داروں نے اقوامِ عالم پر اپنی اجارہ داری کے لیے وضع کیا ہے اور بس۔

سرمایہ داروں نے ہمیں صرف تہذیب کے موہوم تصورات کا ہی اسیر نہیں کیا بلکہ ہماری فکر کو ان اصطلاحات کا تابع کر دیا جو خالصتاً سرمایہ دارانہ تہذیب کی مرہون منت تھیں۔ مثلاً ترقی، ارتقاء، آزادی، جمہوریت، انسانی حقوق، حریت فکر جیسی اصطلاحیں سرمایہ دارانہ رنگ میں کچھ اس طرح رنگ دی گئیں کہ ان کے دوسرے معانی رفتہ رفتہ ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ مہذب زندگی کا تصور اب آزاد منڈی کی معیشت، صنفی مساوات، مجموعی قومی پیداوار اور فرد کی اوسط آمدنی سے لگایا جانے لگا۔ جب مہذب زندگی کے ان پیمانوں کو حتمی سمجھ لیا جائے تو پھر ان مفروضات کے تنقیدی تجزیے کا امکان ختم ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سرمایہ داری کو نظری طور پر چیلنج کرنے کا امکان جاتا رہا۔ اس صورتِ حال نے سرمایہ داروں کے لیے بڑے پیمانے پر لوٹ کھسوٹ کے امکانات پیدا کر دیئے۔ کارنیگی اور راک فلر جنہیں امریکہ میں معماران قوم کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے دراصل سرمایہ دارانہ نظام جبر کے قیام میں بہیمانہ ید طولیٰ رکھتے تھے۔ کہنے کو تو ان حضرات نے امریکہ میں رسل و رسائل کا وسیع نظام تعمیر کیا لیکن اس کے عوض انہوں نے بے پناہ قطع اراضی اپنے نام کر لی۔ اس بات کی طرف عام لوگوں کی توجہ کم ہی گئی کہ نئی دنیا کے یہ معمار دراصل لندن کے Rothschilds جیسے یہودی سرمایہ داروں کے ایجنٹ کے طور پر کام کر رہے تھے۔ یقیناً شاہراہوں اور ریل گاڑیوں

کے وسیع نظام کی تعمیر کا سہرا ان کے سر جاتا ہے البتہ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان حضرات نے ہمارے دل ودماغ کی شاہراہوں کو مسدود کرنے میں بھی کلیدی رول انجام دیا ہے۔ ان دونوں نے غیر معمولی مالیت کے اوقاف تشکیل دیئے جس نے آنے والے دنوں میں امریکی نظام تعلیم اور فکر وتحقیق پر مکمل طور پر اپنی اجارہ داری قائم کرلی۔ سائنسی تحقیق کو اگر ایک طرف عسکری اور صنعتی اداروں کی خدمت پر مامور کیا گیا تو سماجی علوم سے امریکی تہذیب کی برتری اور عظمت کے پروپیگنڈے کا کام لیا گیا۔ آج اگر ہمارے دانشور سرمایہ دارانہ اصطلاحات میں کلام کرنے اور غیر شعوری طور پر اسی چوکھٹے میں سوچنے پر خود کو مجبور پاتے ہیں تو اس کے پیچھے دراصل ان ہی سرمایہ دارانہ اوقاف کی کارفرمائی ہے۔

بعض بنیادی تہذیبی تصورات کو مخصوص معانی عطا کرنے اور جمہوری نظام پر سرمایہ داروں کی مکمل اجارہ داری سے پوری دنیا میں ترقی کے امریکی ماڈل کا زور شور سے چرچا ہوا اور اسے ترقی کا حتمی پیمانہ سمجھ لیا گیا۔ آنے والے دنوں میں سرد جنگ میں امریکہ کی فتح، متحدہ یورپ کا عروج اور ہندوچین میں آزاد منڈی کی معیشت کے فروغ سے ایسا محسوس ہوا گویا اب دنیا کے لیے امریکی ماڈل کے علاوہ کوئی متبادل نہیں رہ گیا ہے۔ معیشت کے مصنوعی ارتقاء اور معیار زندگی کی آسائشوں نے کوئی نصف صدی تک ہمیں صورتِ حال کے واقعی ادراک سے روکے رکھا۔ ہم اس نکتے کو سمجھنے سے قاصر رہے کہ معیشت کا نمو اور زندگی کی چمک دمک کے پیچھے دراصل تیل کے بے محابا استعمال کو دخل ہے جو نئی تہذیب کے معماروں کو تقریباً مفت ہاتھ آ گیا ہے۔ سرمایہ داروں نے پیداوار میں اضافے کے لیے ٹکنالوجی کو اس کی منتہا تک استعمال کرنے کی کوشش کی اور اس عمل میں کوئی کسر نہ چھوڑی کہ سستے تیل کے استعمال سے پیدوار میں جتنا اضافہ ممکن ہو کرلیا جائے۔ نئی معیشت جو دراصل تیل کے جلووں پر قائم تھی، نے ایک ایسی صورتِ حال کو جنم دیا جہاں زیادہ سے زیادہ تیل خرچ کرنا صنعت کے فروغ کی ضمانت بن گیا۔ جن قوموں نے جتنا زیادہ تیل صرف کیا ان کے یہاں دولت کے انبار لگ گئے۔ سرمایہ داروں کے لیے اس سے بہتر اور کیا صورتِ حال ہوسکتی تھی کہ وہ سستے تیل کے بے محابا استعمال سے بے پناہ سرمایہ اکٹھا کرلیں۔ تیل کی تہذیب پر چونکہ سرمایہ داری کی گرفت خاصی مضبوط تھی اس لیے سرمایہ داروں نے جس طرح چاہا تیل کی نعمت کو اپنی دولت کے اضافے کے لیے استعمال کیا۔ البتہ آج جب کہ تیل کے کنوؤں کے خشک ہونے کے آثار ہویدا ہیں اور صاف محسوس ہو رہا ہے کہ ہم مابعد کاربن عہد کی طرف گامزن ہیں، سرمایہ داروں کو تیل کی ریفائنری قائم کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں شاید انہیں اس بات کا احساس ہو چلا ہے کہ آنے والے دنوں میں جب تیل ہی نہ ہوگا تو ریفائنری کے قیام پر کیوں پیسہ صرف کیا جائے۔

تو کیا آنے والے دنوں میں مبنی بر تیل مغربی تہذیب اچانک زمین بوس ہو جائے گی؟ میتھو سائمن جو امریکی صدر بش کے انرجی ایڈوائزر رہیں ان کا کہنا ہے کہ صورتِ حال انتہائی دھماکہ خیز ہے۔ ایک آن لائن مجلّہ fromthewilderness.com کو

انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے اس مسئلہ کو دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ قرار دیا جس کے بارے میں بقول ان کے اہل سیاست نے کوئی متبادل پلان نہیں تیار کر رکھا ہے۔ یونیورسٹی یا دوسرے اعلیٰ علمی اداروں سے بجا طور پر یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ اس بحران کا کوئی حل پیش کریں گے لیکن تعلیمی اداروں پر سرمایہ داروں کی مکمل گرفت کے سبب اب اس بات کی توقع نہیں رہ گئی ہے کہ ان اداروں سے کسی متبادل فکر کو فروغ مل سکے گا۔ دانش گاہوں میں اب غور فکر کا ماحول کہاں کہ اب ان کا بنیادی کام آزاد منڈی کی معیشت کے لیے دل و دماغ پیدا کرنا ہے۔ ایک ایسی دنیا میں جہاں ٹیکنالوجی کو سرمایہ کے فروغ پر مامور کر دیا گیا ہو، سرمایہ دار یہ کب چاہے گا کہ لوگ فلسفیانہ مباحث یا غور و فکر میں اپنا وقت ضایع کریں۔ انہیں تو ایک ایسی فوج کی ضرورت ہے جو تکنیکی نوعیت کا کام بڑے پیمانے پر انجام دے سکے۔ اعلیٰ علمی مقاصد کے خاتمے اور اس کی جگہ معلومات پر مبنی دانش گاہوں کے قیام نے سرمایا داروں کے مقاصد کی تکمیل کے لیے کمپیوٹر شناس انسانوں کی ایک ایسی فوج ظفر موج تیار کر دی ہے جو بیچارے نہ تو غور و فکر کی لذت سے آشنا ہیں اور نہ ہی انہیں زبان کا بنیادی شعور ہے جو غور و فکر کے لیے لازمہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تجارتی نوعیت کے تعلیمی اداروں نے یک رخے انسان کو جنم دیا ہے جس کا مقصدِ وحید دولت کا زیادہ سے زیادہ ارتکاز ہے اور بس۔ یہ حضرات اپنے بہترین لمحات میں اگر کچھ سوچ سکتے ہیں تو صرف یہ کہ ماحولیاتی آلودگی پر کیسے قابو پایا جائے، خورد و نوش کی فطری اشیاء کے نظام کو کیسے بحال کیا جائے، صاف ستھرے قابلِ شُرب پانی کا حصول کیسے ممکن ہو۔ پہلے تو ان حضرات نے فطری وسائل کو تباہ کیا، ندی، نالے، تالاب اور زمینوں کو مختلف قسم کے کیمیاوی چھڑکاؤ سے آلودہ کر دیا اور اب انہیں یہ فکر ستائے دیتی ہے کہ دنیا کو صاف پانی، کھاد سے پاک غذا اور غیر آلودہ ہوا فراہم کرنے کے لیے کیا کچھ کیا جانا چاہیے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو ماحولیاتی آلودگی کے حوالے سے مغربی تہذیب کے سخت ناقد رہے ہیں اور جنہیں مغرب میں اپنی تہذیب کے باغی کے طور پر دیکھا جاتا رہا ہے، انہیں بھی یہ فکر ستائے دیتی ہے کہ تیسری دنیا کے ممالک میں صاف ستھرے بیت الخلاء (فلش ٹوائلٹ) کا فقدان ہے۔ وہ اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں کہ روایتی معاشروں میں جہاں متبادل زندگی کا انداز اب بھی باقی ہے، جہاں زندگی کا فطری آبشار اب بھی بہہ رہا ہے وہاں نئی تہذیب کے ان مسائل نے ابھی انسانوں کو اپنی گرفت میں نہیں لیا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ان حضرات کے ہاں مہذب زندگی کا تصور صرف فلش ٹوائلٹ سے عبارت ہے۔

پس چہ باید کرد

خواہ ہم اس خیال کے قائل ہوں کہ آنے والے دنوں میں تیل کا ذخیرہ بہت جلد ختم ہو جائے گا یا ان امید افزاء بیانات پر یقین کریں جن کا اظہار گاہے بگاہے تیل کی صنعت سے وابستہ حضرات کرتے رہے ہیں البتہ اس بحث کی حساسیت کا تقاضہ ہے کہ

اسے عوامی گفتگو کا موضوع بنایا جائے۔ اوپیک کے تیسرے عالمی سیمینار ۲۰۰۶ء میں سعودی آرامکو کے صدر عبداللہ جمعہ نے دنیا کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ اگر مستقبل کے سلسلے میں ان کے اندازے صحیح ثابت ہوئے تو دنیا کو ۱۴۰ سال تک تیل کی رسد اسی طرح جاری رہ سکے گی۔ عبداللہ جمعہ نے یہ اندازے دراصل ان مفروضات پر قائم کئے ہیں کہ آنے والے دنوں میں ٹیکنالوجی میں حیرت انگیز تبدیلیاں آئیں گی، تیل کے نئے ذخائر دریافت ہوں گے اور ہم موجودہ ذخائر کے آخری قطرے کو بھی نکال لینے کی پوزیشن میں ہوں گے۔ تیل کی کیچڑ جسے اصطلاح عام میں بھاری تیل کہا جاتا ہے اور جسے اب تک قابل اعتناء نہیں سمجھا گیا ہے، عبداللہ جمعہ کے اندازوں میں اس کیچڑ کو بھی بہت اہمیت حاصل ہے۔ حالانکہ اس صنعت سے وابستہ ہونے کے سبب وہ بھاری تیل کو قابل استعمال بنانے کے اسرار وعواقب سے ناآگاہ نہیں ہیں کہ اگر ایسا ہوا تو اس کے نتیجے میں جو آلودگی پیدا ہوگی اس سے گوناگوں قسم کے ماحولیاتی مسائل جنم لیں گے۔ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ تیل ختم ہو رہا ہے یا ابھی اس کی خاصی مقدار باقی ہے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ اس پورے قضیے میں ان امور کا خاص طور پر خیال رکھا جانا چاہئے جس کے لئے بحیثیت مسلمان ہم خاص طور پر سزا وار ہیں۔

دنیا کے وہ بیس ممالک جن کے پاس تیل کے ذخائر کا ۹۵٪ حصہ ہے ان میں بارہ مسلم ممالک شامل ہیں جن کے پاس مجموعی طور پر تیل کا ۶۸٪ ذخیرہ موجود ہے۔ کچھ یہی حال قدرتی گیس کا ہے جس کے نصف سے زائد ذخائر مسلم علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔ روس کے بعد ایران اور قطر اس سلسلے میں خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ امت مسلمہ جو اس وقت ۵۷ چھوٹے بڑے ملکوں کا مجموعہ ہے نہ صرف یہ کہ جغرافیائی اعتبار سے اہم علاقوں میں واقع ہے بلکہ خود مغربی تہذیب کے عین قلب میں اب مسلمانوں کی قابل ذکر آبادی وجود میں آگئی ہے۔ اور سب سے اہم بات تو یہ کہ ہم مسلمان صرف تیل اور دوسرے فطری وسائل سے مالا مال نہیں بلکہ خدا کی آخری اور غیر محرف کتاب بھی ہمارے ہی درمیان موجود ہے۔ جزیرۃ العرب میں تیل کی یہ دولت ایک بڑی خدائی اسکیم کا حصہ ہے یہ ایک بڑی وقیع امانت ہے جو اللہ نے ان لوگوں کے ہاتھوں میں دی ہے جن پر آخری لمحے تک اقوام عالم کی قیادت کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔ قرآن خدا کے بے پایاں فضل کا احساس دلاتے ہوئے ہم سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ ہم انسان اور کائنات کے توازن کو درہم برہم نہ ہونے دیں:

﴿ الرَّحْمٰنُO عَلَّمَ الْقُرْءَ انَ Oخَلَقَ الْإِ نَسٰن O عَلَّمَهُ الْبَيَان O الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ بِحُسْبَانٍOوَ النَّجْمُ وَ الشَّجَرُ يَسْجُدَانِ O وَ السَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ O أَلَّا تَطْغَوْا فِى الْمِيْزَان O وَأَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُو الْمِيْزَانَ ﴾

قرآنی تصورِ حیات میں میزان محض عدل کی علامت نہیں بلکہ ایک ایسے ہمہ گیر توازن پر دال ہے جس کا درہم برہم ہونا دنیا

وآخرت کوتباہ وبرباد کرسکتا ہے۔اگلی آیات ہمیں بار بار مختلف انداز سے خدا کی بے پایاں نعمتوں کی طرف متوجہ کرتی ہیں جو اس سرزمین پر، دریاؤں میں اور فضاؤں میں انسانوں کے لیے مسخر کی گئی ہیں۔﴿ فبای آلاء ربکما تکذبان ﴾کی دلکش تکرار ہم سے بار بار یہ مطالبہ کرتی ہے کہ ہم اس فطری توازن یا balance کو تہہ وبالا نہ ہونے دیں۔ بلاشبہ دنیا ہمارے لیے مسخر کی گئی ہے لیکن فطری وسائل کا زیاں یا دوسروں کو اس سے محروم کرنا انسان اور فطرت کے مابین خوشگوار رشتوں کا قاطع ہوسکتا ہے۔ایسی صورت میں فرد کے لیے زندگی کا لطف جاتا رہے گا۔دنیا میں سیاروں کی اپنے مدار پر گردش ایک نظام کے تابع ہے اور یہاں ہر روز ایک نئے جلوہ کا ظہور ہے: ﴿کل یوم هو فی شأن ﴾۔انسانوں کے لیے لازم ہے کہ خدا کی ان عنایات سے لطف اندوز ہونے کے لیے وہ خود کو اس نظام کے ساتھ ہم آہنگ کرے۔وہ اس توازن سے، جو اس کائنات میں قائم ہے، چھیڑ چھاڑ کے بجائے ایک امین کے طور پر اسے برتے۔اگر انسان فطرت سے لطف وکرم کا معاملہ رکھے اور اسے عالم محسوسات میں اپنے تفویض کردہ رول کا احساس ہو تو دنیا اس کے لیے جنت ارضی کا منظر پیش کرنے لگے یہ اس جنت کے علاوہ ہے جس کا وعدہ اللہ نے اہل میزان یا عدل والوں سے کر رکھا ہے۔یہی وہ لوگ ہیں جنھیں دو جنتوں کی بشارت دی گئی ہے۔﴿ ولمن خاف مقام ربه جنتان ﴾۔

آخری کتاب کے حاملین اور تیل کی عظیم دولت کے امین کی حیثیت سے ہم مسلمانوں پر بڑی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ تیل اور تبلیغ گویا مستقبل کی کلید ہے۔اگر ہم تیل کی نکاسی بند کردیں تو چشم زدن میں موجودہ تہذیب زمین بوس ہوجائے۔جب سے ہم نے تبلیغ کی ذمہ داریوں سے منہ موڑا اور قرآن مجید کے مقابلے میں اپنے ہی جیسے انسانوں کی تعبیرات کو سب کچھ سمجھ بیٹھے تب سے نہ صرف ہمارا بلکہ پوری دنیا کا رشتہ خدا کی کتاب سے منقطع ہوگیا۔دنیا بے سمتی کا شکار ہوگئی۔نتیجہ یہ ہوا کہ انسان اور فطرت کے مابین نازک توازن برقرار نہ رہ سکا۔آج ہم جس فضا میں سانس لے رہے ہیں وہاں ماحولیاتی آلودگی، صاف ستھری ہوا قابلِ شُرب پانی کے فقدان جیسے بنیادی مسائل کی ہر طرف گونج سنائی دے رہی ہے۔امارت اور غربت کی خلیج میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے۔ٹیکس کے جبری نظام میں فرد کی آزادی یکسر ختم ہوکر رہ گئی ہے۔کوئی ایسی جائے پناہ نہیں جہاں انسان اس نظامِ جبر سے باہر آزادی کی چند سانس لے سکے۔چاہیں یا نہ چاہیں ہم اس بات پر مجبور ہیں کہ مہمل دفاعی منصوبوں کے لیے اپنی گاڑھی کمائی کا ایک حصہ نظام جبر کے حوالے کرتے رہیں۔تیل کی دولت جب سے سرمایہ داروں کے ہاتھ لگی ہے انسان پر انسانوں کا ظلم مسلسل بڑھتا جارہا ہے۔انسانی تاریخ میں ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا کہ انسان نے اپنے ہی جیسے انسانوں کے قتل اور تباہی کے لیے اتنے خطرناک اور مؤثر اسلحے ایجاد کئے ہوں اور انسانوں کے قتل کو حادثاتی موت یا collateral damage کا نام دیا ہو۔

تیل کی یہ تہذیب جس طرح مغرب میں پروان چڑھی ہے اس نے ہمارے لیے مستقبل کے حوالے سے سخت اندیشے پیدا

کر دیئے ہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ سیاسی نظام پر سرمایہ داروں کی گرفت نے تبدیلی کے امکانات پر ممکنہ پہرے بٹھا دیئے ہیں۔ اس بے سمت تہذیب کو مزید قوت فراہم کرنے کے لیے کیا ہم اسی طرح تیل کی رسد جاری رکھیں اور اس طرح بالواسطہ طور پر اس نظام جبر کو غذا فراہم کرتے رہیں یا مسلمان کی حیثیت سے ہمارا کچھ مختلف رول ہونا چاہیے؟ خدا کے آخری پیغام اور تیل کی عظیم دولت کے امین کی حیثیت سے ہم مسلمانوں پر آنے والی نسلوں کے حوالے سے بھی کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ وہ لوگ جو ابھی دنیا میں نہیں آئے ہیں کیا ان کا یہ حق نہیں کہ وہ ایک صحت مند فضا میں آنکھیں کھولیں۔ گلوبلائزیشن کے نام پر تیل کا اندھا دھند استعمال سیاسی، عقلی اور اخلاقی ہر اعتبار سے ایک جرم عظیم سے کم نہیں۔ آخر اس بات کا عقلی جواز کیا ہے کہ کھانے کا ایک پیکٹ اور پانی کی ایک بوتل ہماری میز تک پہنچنے سے پہلے ہزاروں کیلومیٹر کا سفر کرے یا ہم اپنی رہائش گاہوں سے دفتر تک ہر روز دو تین گھنٹے آمد ورفت میں ضائع کریں۔ بھلا یہ کیسی عقلمندی ہے کہ پانی کی ایک بوتل جو ہمالیہ کے دامن میں بھری جاتی ہو ہزاروں کلومیٹر دور چنّئی اور ممبئی کے صارفین کو دستیاب ہو یا دارجلنگ کی چائے پہلے برطانیہ اکسپورٹ ہو اور پھر وہاں سے دنیا بھر میں اور خود ہندوستان میں دوبارہ امپورٹ کی جائے۔ تیل کے ناعاقبت اندیشانہ استعمال نے مختلف ملکوں کے مابین ایسی تجارت کو فروغ دیا ہے جس میں بیچنے والا وہی چیز خرید بھی رہا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ہالینڈ اور انگلینڈ باہم ایک دوسرے کو گوشت اور دودھ مکھن جیسی اشیاء بیک وقت بیچتے اور خریدتے رہتے ہیں اور ایسا کرنے میں یہ مما لک تنہا نہیں ہیں۔ آزاد منڈی کی تجارت میں یہ سب کچھ معمول کی بات سمجھی جاتی ہے۔ جب ہم سپر مارکٹ میں مختلف ملکوں کے بنے ہوئے پنیر کے پیکٹ یا دوسری اشیائے صرف کی مختلف مصنوعات دیکھتے ہیں تو ہم اسے گلوبلائزیشن کی برکتوں سے تعبیر کرتے ہیں لیکن درحقیقت اس کے پیچھے تیل جیسی عظیم نعمت کا ناعاقبت اندیشانہ استعمال ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ ایک طرح کا پاگل پن ہے جس پر سرمایہ داروں نے خوش کن اصطلاحات کا لبادہ ڈال رکھا ہے۔

ایک نئی تہذیب کی ضرورت

تیل تو پھر بھی ایک قیمتی شئے ہے نبی کریمؐ نے تو ہمیں پانی جیسی کثرت سے پائی جانے والی شئے کو بھی حزم واحتیاط سے استعمال کرنے کی تاکید کی ہے۔ قدرت کی عطا کردہ نعمتوں کے سلسلے میں اگر انسان تشکر کے جذبات سے لبریز ہو تو یقیناً وہ ان نعمتوں کو برتنے میں کسر نفسی اور حزم واحتیاط کا مظاہرہ کرے گا اور اگر دل ودماغ اس شعور سے خالی ہوں تو فطری وسائل کی طرف اس کا رویہ کبر ونخوت پر محمول ہوگا۔ ہم کوئی نصف صدی سے اس احساسِ نخوت کے سایے تلے جیتے رہے ہیں کہ اگر تیل ختم ہو گیا تو کوئی دوسرا متبادل وجود میں آجائے گا لیکن اب تک کسی عملی متبادل کا حصول ہمارے لیے ممکن نہ ہو سکا۔ اس سے پہلے کہ تیل کے

بقیہ ماندے کنویں خشک ہو جائیں تیل کے امین کی حیثیت سے ہم مسلمانوں پر لازم آتا ہے کہ ہم دنیا کو ایک متوازن طریقۂ زندگی پر آمادہ کریں۔ وہ تمام لوگ خواہ وہ کسی بھی تہذیب میں پائے جاتے ہوں جو اس مسئلہ کا کسی قدر ادراک رکھتے ہیں انہیں اپنا شریک و سہیم بنانے میں ہمیں کسی ذہنی تحفظ کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم عام انسانوں کو اس صورتِ حال سے آگاہ کریں کہ اگر خدا کی اس عظیم نعمت کو اسی طرح غیر منصوبہ بند طریقے سے ضائع کیا جاتا رہا تو تہذیب کا یہ جاہ و حشم چند برسوں میں ہوا ہو جائے گا۔ اگر دنیا کو آنے والے بحران سے بچانا ہے تو ہمیں اپنا طرزِ زندگی بدلنا ہوگا، گویا ہمیں تہذیب کا ڈھانچہ ازسرِنو تشکیل دینا ہوگا۔ اس کے بغیر اب بات بننے کی نہیں۔

ایک ایسے وقت میں جب ترقی کے سرمایہ دارانہ ماڈل نے دل و دماغ کو مسحور کر رکھا ہو، جب اقوامِ عالم کے مابین فلک بوس عمارتوں اور بلند و بالا ٹاوروں کی دوڑ چل نکلی ہو، ایک نئی تہذیب کی دعوت یا متبادل طرزِ زندگی کا قیام کچھ آسان نہ ہوگا۔ گذشتہ دنوں کویت سے ایک خبر آئی تھی کہ وہاں ایک ہزار ایک میٹر بلند الف لیلائی ٹاور کی تعمیر کا منصوبہ بنایا جا رہا ہے۔ ادھر جدہ میں پرنس ولید ایک میل اونچے ٹاور کی تعمیر کا منصوبہ بنا رہے ہیں جس پر دس بلین ڈالر کے صرفے کا تخمینہ ہے۔ برج دبئ جو اس وقت دنیا کی بلند ترین عمارت ہے اسے یہ اندیشہ ستائے دیتا ہے کہ اسے البرج کے نام سے ایک نئے رقیبانہ منصوبے کا سامنا ہے۔ جب تک سرمایہ دارانہ تہذیب کا سکہ چلتا رہے گا اور ہم تہذیب کو بلند و بالا ٹاوروں اور فلش ٹوائلٹ کے پیمانوں سے ناپتے رہیں گے ہمارے لیے ایک متبادل تہذیب یا طرزِ زندگی کا قیام ممکن نہ ہو سکے گا۔